اختر راہی

مسیحی برادری اور انتخابات قومی اسمبلی (۱۹۹۳ء)

۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق مملکت خداداد پاکستان کی آبادی تقریباً ۹۶٫۷ فیصد مسلمانوں اور ۳٫۳ فیصد غیر مسلم اقلیتوں پر مشتمل تھی۔ غیر مسلم اقلیتوں میں بڑی اقلیتیں بالترتیب مسیحی اور ہندو ہیں۔ مسیحی برادری کل آبادی کا ۱٫۵۵ فیصد ہے جب کہ اقلیتی آبادی میں مسیحی برادری کا تناسب ۴۶٫۷ فیصد ہے۔ گزشتہ مردم شماری کو تقریباً بارہ سال ہو رہے ہیں اور آبادی میں بحیثیت مجموعی ۳۵ سے ۴۰ فیصد اضافہ ہو چکا ہے۔ اسی لحاظ سے اقلیتی آبادی کے حجم میں اضافہ ہوا ہے تاہم آبادی میں فیصد کمی بیشی زیادہ متوقع نہیں۔

۱۹۸۱ء کے اعداد و شمار کے مطابق مسیحی آبادی کی صوبہ وار / خطہ وار تقسیم یہ تھی۔[۱]

اسلام آباد	۷،۸۴۶	۰٫۶ فیصد
قبائلی علاقہ جات	۵،۹۳۱	۰٫۵ فیصد
شمال مغربی سرحدی صوبہ	۳۸،۵۸۳	۲٫۹ فیصد
پنجاب	۱۰،۱۶،۰۳۷	۸۱٫۰ فیصد
سندھ	۱،۷۶،۸۹۸	۱۳٫۵ فیصد
بلوچستان	۲۰،۱۳۱	۱٫۵ فیصد
کل آبادی	۱۳،۱۰،۴۲۶	۱۰۰ فیصد

مسیحی برادری کی غالب اکثریت یعنی ۸۱ فیصد پنجاب میں آباد ہے۔ ۱۳٫۵ فیصد سندھ، ۲٫۹ فیصد سرحد اور ۱٫۵ فیصد بلوچستان کی آبادی کا حصّہ ہے۔ مسیحی آبادی نسلی پس منظر کے اعتبار سے واضح طور پر تین گروہوں میں منقسم ہے۔ سب سے بڑا گروہ پنجابی مسیحیوں پر مشتمل ہے جن کے آباءو اجداد کا تعلق ہندوؤں کی نچلی ذاتوں یا ذات باہر لوگوں سے تھا۔ یہ لوگ غیر ملکی مشنریوں کی تگ و دو سے حلقۂ مسیحیت میں داخل ہوئے تھے۔ پادری جوزف ارشد کے الفاظ میں[۲]

> [یہ] لوگ نہ صرف کم ذات لوگ خیال کیے جاتے تھے بلکہ یہ روایتی ہندوستانی ذات سسٹم میں اچھوت لوگ بھی سمجھے جاتے تھے۔ یہ ہمیشہ دیہاتوں سے باہر کے علاقوں میں

رہتے تھے۔ یہ پلید لوگ خیال کیے جاتے تھے اور ایسے کام کرتے تھے جن کو معاشرے میں گندے کاموں کی وجہ سے حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

آج پنجاب کی مسیحی برادری یوں تو پورے صوبے میں منتشر ہے مگر اس کا بڑا حصہ چند اضلاع -- سیالکوٹ، سرگودھا، فیصل آباد، شیخوپورہ اور لاہور میں آباد ہے۔ دو تہائی سے زائد پنجابی مسیحی آبادی شہروں میں رہتی ہے۔ صوبہ سرحد اور قبائلی علاقہ جات کے مسیحی بھی نسلاً پنجابی ہیں [۳] جو خود یا اُن کے آباء و اجداد تلاشِ روزگار میں پنجاب سے سرحد آ گئے تھے۔ صوبہ سرحد کی نصف سے زائد مسیحی آبادی صرف ایک ضلع یعنی ضلع پشاور میں آباد ہے۔

بلوچستان کی مسیحی آبادی، صوبہ سرحد کے اپنے بھائی بندوں کی طرح شہروں میں رہتی ہے۔ مسیحی برادری کی بڑی تعداد کوئٹہ، لورالائی اور سبی میں آباد ہے۔

جہاں تک شہری مسیحی آبادی کی اقتصادی صورتِ حال کا تعلق ہے۔ ناخواندہ اور پسماندہ طبقے صفائی کے پیشے سے منسلک ہیں، تاہم جدید تعلیم سے بہرہ ور طبقہ دفتری ملازمتوں، تعلیم اور طب و صحت کے شعبوں میں پیش پیش ہے۔ نوآبادیاتی دور میں مشنری تعلیمی اور طبّی اداروں نے مسیحی برادری کو ان شعبوں میں آگے آنے کے بھرپور مواقع مہیا کیے تھے جو اسے بدستور حاصل ہیں۔ نرسنگ کے شعبے میں مسیحی خواتین (اپنی آبادی کے لحاظ سے) کسی بھی دوسری برادری کی نسبت زیادہ ہیں۔

صوبہ سندھ کی مسیحی آبادی ثقافتی اعتبار سے پنجاب اور سرحد کی آبادی کی طرح یک رنگ نہیں۔ اس میں پنجابی مسیحیوں کے ساتھ گوان مسیحی اور اینگلو انڈین شامل ہیں۔ اوّل الذکر کا تعلق سابق پرتگیز نوآبادی گوا سے ہے۔ گوان آبادی زیادہ تر کراچی میں ہے۔ معاشی طور پر یہ خوشحال ہے اور تعلیمی طور پر اکثریتی مسلم آبادی سے بھی آگے ہے۔ تعلیم یافتہ ہونے کے باعث طب و صحت، تعلیم اور وکالت کے پیشوں سے منسلک ہے۔ گوان خواتین غیر ملکی سفارتی مشنوں یا کاروباری فرموں میں بطور سیکرٹری کام کرتی ہیں۔ سماجی اعتبار سے گوان مسیحی اپنے آپ کو پنجابی مسیحیوں سے اس لحاظ سے برتر خیال کرتے ہیں کہ اُن کے اجداد کا تعلق ہندو معاشرے کے اعلیٰ ترین طبقے یعنی برہمنوں سے تھا، جب کہ پنجابی مسیحی سماجی طور پر پسماندہ طبقات کے نمائندہ ہیں۔ گوان آبادی، پنجابی مسیحیوں اور خود اعلیٰ مسلم طبقات کی نسبت کہیں زیادہ مغربی تہذیب اپنائے ہوئے ہے۔

گوان مسیحیوں کے ساتھ چھوٹی سی اینگلو انڈین یا یوریشین مسیحی برادری ہے جو کراچی اور اب اس کے معدودے چند افراد اسلام آباد میں مقیم ہیں۔ اینگلو انڈین یا یوریشین آبادی ۱۶۳۸ء کے بعد وجود میں آئی جب برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے مدراس میں قدم جمائے تھے۔ یورپی مردوں اور مقامی خواتین کی گھریلو زندگی سے وجود میں آنے والے اس گروہ نے اپنی شناخت ہمیشہ برطانوی حکمرانوں کے ساتھ کی۔ ابتداءً برطانوی حکمرانوں نے اُن کی شناخت کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں تقریباً اپنے

برابر مقام دیا مگر یہ صورت حال اُس وقت بدل گئی جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے اعلیٰ کارپردازوں کے درمیان اینگلو انڈین طبقے کے خصائص پر اظہار خیال ہونے لگا تھا۔ یوریشین جن میں پرتگیز اصل کے غریب کیتھولکوں کی اکثریت تھی، ایسٹ انڈیا کمپنی کے اینگلیکن پروٹسٹنٹ ڈائریکٹروں کے دل میں اپنے لیے نرم گوشہ پیدا نہ کر سکے۔ وہ مقامی اور یورپی آبادی دونوں کی برائیوں کا مجموعہ خیال کیے جانے لگے۔ یعنی اگر وہ ایک طرف مقامی آبادی کی سستی، بے جا توکل، اپنے اوپر اعتماد کی کمی جیسی برائیوں کا شکار تھے تو دوسری طرف اُن میں یورپی آبادی کی کثرتِ شراب نوشی، بے جا اظہارِ تفاخر اور نمود و نمائش جیسی خرابیاں موجود تھیں۔[۴]

۱۷۹۱ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے مخلوط نسل کے لوگوں کو اعلیٰ سول، فوجی اور بحری عہدوں سے الگ تھلگ رکھنے کا فیصلہ کیا، تاہم دفتری اُمور سے متعلق ملازمتوں کے دروازے اُن کے لیے ترجیحاً کھلے رہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں یوریشین طبقے کو اپنی وفاداری جتانے کا ایک موقع ہاتھ آیا جب مقامی آبادی نے حصولِ آزادی کی ایک کوشش کی۔ یہ طبقہ حکمرانوں کی مدد میں پیش پیش تھا۔ چنانچہ نومبر ۱۸۵۸ء میں جب تاج برطانیہ نے برصغیر کا نظم و نسق سنبھالا تو یوریشین طبقے کو سرپرستی کا مستحق خیال کیا گیا۔ ایک اینگلو انڈین رجمنٹ قائم کی گئی جو بنگال میں تعیّنات رہی۔ اس طبقے نے پورے نوآبادیاتی دور میں اپنی قسمت برطانوی حکمرانوں سے وابستہ رکھی۔ پہلی عالمی جنگ میں اس نے ریلوے، ٹیلی گراف اور کسٹمز کے محکموں میں قرار واقعی خدمات انجام دیں اور جنگ کے خاتمے پر اُس کے لیے سنٹرل لیجسلیٹو اسمبلی میں ایک نشست مخصوص کی گئی۔ ۱۹۲۱ء میں یہ لوگ All India - Anglo Indians and Domiciled European Association کی شکل میں منظم ہوئے۔ یہ طبقہ Auxiliary force میں پیش پیش تھا جو باقاعدہ مسلّح افواج کے بعد دفاع کی دوسری لائن خیال کی جاتی تھی۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران میں اینگلو انڈین یا یوریشین Auxiliary Force میں دو تہائی اکثریت رکھتے تھے۔ جنگِ آزادی میں مقامی آبادی سے دور رہنے بلکہ مخالفت میں پیش پیش ہونے کے باعث اس طبقے نے مقامی آبادی کی نظروں میں کبھی اعلیٰ مقام حاصل نہیں کیا چنانچہ آزادی کے بعد یوریشین آبادی کا بڑا حصہ آسٹریلیا، کینیڈا اور برطانیہ منتقل ہو گیا، تاہم اِس طبقے کے رہے سہے لوگ، جو سو فیصد اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ بڑے شہروں کراچی اور اسلام آباد میں رہ رہے ہیں اور خود اِن کا پسماندہ مسیحی آبادی سے زیادہ تعلق واسطہ نہیں ہے۔[۵]

دستور پاکستان (۱۹۷۳ء) کی رُو سے قومی اسمبلی اور چاروں صوبائی اسمبلیوں میں غیر مسلم اقلیتوں کے لیے نشستیں مخصوص ہیں۔[۶] قومی اسمبلی کی دس اقلیتی نشستوں میں سے چار مسیحیوں کے لیے مخصوص ہیں۔ اِسی طرح بلوچستان، سرحد، پنجاب اور سندھ کی صوبائی اسمبلیوں میں بالترتیب ایک، ایک،

پانچ اور دو نشستیں مخصوص کی گئی ہیں۔ یہ نشستیں جداگانہ انتخابات کے تحت پُر کی جاتی ہیں۔

طریقِ انتخاب کا مسئلہ قیامِ پاکستان کے بعد دستور سازی کے اہم مسائل میں شامل رہا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں مشرقی پاکستان کی ہندو آبادی نے جداگانہ طریقِ انتخاب کی مخالفت کی جس کی بنیاد پر پاکستان معرضِ وجود میں آیا تھا۔ ہندو اقلیت کی تائید مشرقی پاکستان کی سیکولر جماعتوں - عوامی لیگ، کرشک سرامک پارٹی، نیشنل عوامی پارٹی اور گنا تنتری دل - نے کی جو انتخابات میں ہندو آبادی کے ووٹوں پر نظر لگائے ہوئے تھیں۔ مشرقی پاکستان کے دیندار طبقے اور پاکستان کی دینی سیاسی جماعتوں - مسلم لیگ، نظامِ اسلام پارٹی اور جماعتِ اسلامی پاکستان نے جداگانہ انتخابات کے حق میں آواز اٹھائی۔ مؤخر الذکر جماعتوں کی رائے میں مخلوط طریقِ انتخاب پاکستان کی نظریاتی اساس کو کمزور کرنے کے مترادف تھا اور یہ اُس دو قومی نظریہ کے مخالف تھا جس کے تحت پاکستان وجود میں آیا تھا۔

۱۹۴۷ء سے اب تک طریقِ انتخاب کے حوالے سے مندرجہ ذیل ادوار گزرے ہیں۔

◇ پہلی دستور ساز اسمبلی (۱۹۴۷ء - ۱۹۵۴ء) نے جداگانہ طریقِ انتخاب کی حمایت کی۔

◇ دوسری دستور ساز اسمبلی (۱۹۵۵ء - ۱۹۵۶ء) نے طریقِ انتخاب کا مسئلہ مستقبل پر چھوڑ دیا جسے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی صوبائی اسمبلیوں کی آراء کی روشنی میں طے ہونا تھا۔ مغربی پاکستان (موجودہ پاکستان) میں جداگانہ طریقِ انتخاب اور مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) میں مخلوط طریقِ انتخاب اپنایا گیا۔

◇ فوجی حکومت (۱۹۵۸ء - ۱۹۶۲ء) نے جداگانہ یا مخلوط براہِ راست طریقِ انتخاب کی جگہ بالواسطہ انتخاب کا نظام رائج کیا۔ فوجی حکومت کے مقرر کردہ دستور ساز کمیشن نے جسٹس شہاب الدین کی نگرانی میں مرتبہ رپورٹ میں جداگانہ طریقِ انتخاب تجویز کیا (۱۹۶۲ء) مگر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے ۱۹۶۲ء کے دستورِ پاکستان میں بنیادی جمہوریتوں کے نظام کو تحفظ دیا گیا۔ اس دستور کے تحت ۱۹۶۴ء میں بالواسطہ عام انتخابات ہوئے۔ ۱۹۶۹ء کی عوامی تحریک کے نتیجے میں ایک بار پھر مارشل لاء نافذ ہوا اور بالواسطہ انتخابات کا طریقہ ختم ہوا۔

◇ دسمبر ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں مخلوط طریقِ انتخاب اپنایا گیا مگر انتخابی نتائج کو تسلیم نہ کیے جانے پر سیاسی بحران پیدا ہوا۔ جو بیرونی مداخلت کا پیش خیمہ ثابت ہوا اور مشرقی پاکستان، وفاق سے الگ ہو کر بنگلہ دیش بن گیا۔

◇ ۱۹۷۳ء کے دستورِ پاکستان میں مخلوط انتخاب کا طریق اپنایا گیا جس کے تحت ۱۹۷۷ء کے متنازعہ انتخابات منعقد ہوئے۔ سیاسی احتجاجی تحریک دستور کے معطّل کیے جانے اور مارشل لاء کے نافذ ہونے پر منتج ہوئی۔ مارشل لاء کے سائے تلے ۱۹۸۵ء میں سیاسی جماعتوں کی شمولیت کے بغیر انتخابات ہوئے مگر طریقِ انتخاب میں تبدیلی کرتے ہوئے جداگانہ طریقِ انتخاب اپنایا گیا۔ اِس کے بعد نومبر

۱۹۸۸ء اور اکتوبر ۱۹۹۰ء کے انتخابات جداگانہ طریقِ انتخاب کے تحت منعقد ہوئے ہیں۔ حالیہ انتخابات (اکتوبر ۱۹۹۳ء) بھی اسی طریقِ انتخاب کے تحت منعقد ہو رہے ہیں۔

طریقِ انتخاب کے بارے میں مسلم اکثریت اور غیر مسلم اقلیّتیں اپنے اپنے طور پر باہم منقسم رہی ہیں اور یہ تقسیم مسلسل چلی آ رہی ہے۔ تاریخِ پاکستان کے اوّلین پارلیمانی دور میں مسیحی رہنما جوشوا فضل الدین [۷] (۱۹۰۳ء - ۱۹۷۶ء) جداگانہ طریقِ انتخاب کے زبردست حامی رہے تھے۔ انھوں نے [Separate Electorates: The Life - blood of Pakistan] لاہور: پنجابی دربار (۱۹۵۶ء) کے نام سے ایک کتاب شائع کی۔ ۱۹۷۰ء میں جب جداگانہ طریق انتخاب کا اصول ترک کرتے ہوئے انتخابات کا انعقاد ہوا تو اُنھوں نے "آزاد پاکستان مسیحی پارٹی" کے پلیٹ فارم سے اِس کے خلاف سخت احتجاج کرتے ہوئے انتخابات کا بائیکاٹ کیا۔

سابق رکن اسمبلی لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) ڈبلیو- ہربرٹ نے طریقِ انتخاب کے بارے میں اپنی رائے ان الفاظ میں بیان کی ہے۔ [۸]

> * نوّے فیصد ہمارے مسیحی بھائی گاؤں یا شہروں میں جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے ہاں یا تو مزارعے ہیں یا ملازم ہیں۔ خاص طور پر دیہاتوں میں تو یہ لوگ پاکستان کے وجود میں آنے سے آج تک ان ہی کی زمینوں پر بیٹھے اور بستے ہیں، لہذا آزادی یا جمہوریت کی بات اپنی جگہ لیکن اُنہیں [مخلوط انتخاب میں] ووٹ اپنے ہی جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کو دینے ہوں گے۔ اگر کسی نے کوئی اور روّیہ اختیار کرنے کی کوشش کی تو اُن کے گھروں کو بل ڈوز کر دیا جائے گا یا اُن کی ملازمت ختم کر دی جائے گی۔ یہاں میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ روّیہ کسی مذہبی تعصّب یا برادری کے نظریے کی وجہ سے نہیں بلکہ فقط اور فقط اس لیے ہے کہ وقت کے سامنے تیزی سے بدلتے ہوئے معاشرے میں محض دولت اور مادیّت عروج پر ہے اور یہ روّیہ اب انسانی فطرت میں سما گیا ہے۔ یہ انسانی فطرت ہر مذہب اور عقیدے کے لوگوں پر یکساں اثر انداز ہوتی ہے۔
>
> *[مخلوط انتخاب میں] جب ہمارے نمائندوں کو اپنی برادری کے لوگوں کے ووٹوں کی ضرورت ہوگی تو پھر ہمیں ووٹ لینے کے لیے مسیحی بھائیوں کے پاس نہیں بلکہ ان ہی جاگیرداروں یا سرمایہ داروں کے پاس جانا ہوگا اور اس کا فیصلہ وہ یوں کریں گے کہ ووٹ اُس مسیحی نمائندے کو دیے جائیں جو اُنہیں ڈسٹرکٹ کونسل چیئرمین شپ یا اُن کی پارٹی کے نمائندوں کو اسی طرح دوسرے اداروں کے لیے اپنے ووٹ دینے کا عہد کریں۔ یہ میری محض منطقی سوچ نہیں ہے بلکہ یہ ایک حقیقت ہے۔ اِس طرح مسیحیوں کے ووٹ کی آزادی کا گلا گھونٹنے کے ذمہ دار ہم خود ہوں گے۔ جب کہ ہم کو یہ

حق [جداگانہ انتخاب]، جہاں تک تاریخ دیکھی جا سکتی ہے، پہلی بار اسلامک ریپبلک آف پاکستان نے ہی دیا ہے۔

تاہم مسیحی برادری کے بعض دوسرے رہنما جداگانہ طریقِ انتخاب کے خاتمے کے لیے کوشاں ہیں۔ اُن کی رائے کے مطابق جداگانہ طریقِ انتخاب نے اُنہیں ملک کی عام آبادی سے کاٹ کر رکھ دیا ہے اور اقلیتوں میں اِس سے دوسرے درجے کا شہری ہونے کا احساس پرورش پا رہا ہے۔ متعدّد مذاکروں، بیانوں اور اداراتی تحریوں کے ذریعے جداگانہ طریقِ انتخاب ختم کرنے کا مطالبہ کیا جا چکا ہے، مگر جداگانہ طریقِ انتخاب کے خاتمے پر کیا کوئی اقلیتی رہنما اسمبلی کے ایوان تک پہنچ سکتا ہے؟ اور اگر کوئی غیر مسلم منتخب ہو کر قانون ساز ادارے تک پہنچ جاتا ہے تو وہ کس قدر اپنی مذہبی برادری کا مرہون احسان ہوگا اور کس قدر اُس سیاسی جماعت کا جِس کے تعاون سے وہ ایوان تک پہنچا۔ جب کہ اُس جماعت کی باگ ڈور لامحالہ ایک مسلمان کے ہاتھ میں ہوگی۔

مخلوط طریقِ انتخاب کے ذریعے کسی اقلیت کے لیے ممکن نہیں کہ اُس کے نمائندے اسمبلیوں میں پہنچیں چنانچہ ایک رائے یہ ہے کہ جداگانہ طریقِ انتخاب تو ختم کر دیا جائے مگر اقلیتوں کے لیے مخصوص نشستیں علیٰ حالہ قائم رہیں۔[9] اور اِن اقلیتی نمائندوں کا انتخاب عام نشستوں پر منتخب ہونے والے مسلمان ارکانِ اسمبلی کر لیں۔ کیا اِس طرح اقلیتی نمائندے اپنی برادریوں کے سامنے جواب دہ ہوں گے یا اسمبلی کی اکثریتی جماعت کے مرہون احسان ہوں گے؟ اس صورتِ حال سے آگاہ مگر پاکستان کی اسلامی نظریاتی حیثیت کو تسلیم نہ کرنے والوں کی رائے یہ ہے کہ[10]

> جنرل ضیاء الحق نے جداگانہ طرز انتخاب ایک مخصوص اسلامی نقطۂ نظر رکھنے والے طبقے کے کہنے پر متعارف کروایا جس کا خیال ہے کہ پاکستان ایک اسلامی ملک ہے، لہذا یہاں پر غیر مسلموں کو کاروبارِ حکومت سے باہر رکھا جانا چاہیے۔ ہم اِسے بنیادی طور پر غلط کہتے ہیں کیوں کہ شہریت مذہبی بنیادوں پر نہیں ہوتی کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو آج سارے مسلمان پاکستانی ہوتے۔ شہریت جغرافیائی [حقیقت] اور آئین کو ماننے کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ اِس لیے ہم سب برابر کے شہری ہیں گا اِس ضمن میں میری ایک تجویز ہے کہ ہمیں عام انتخاب میں بھی ووٹ کا حق حاصل ہو اور جب کوئی عیسائی امیدوار آئے تو اُس وقت بھی ہمیں یہ حق حاصل ہو کہ ہم اسے منتخب کر سکیں اور اس امیدوار کو بھی مسلمان اور عیسائی اکھٹے ہی ووٹ دیں تاکہ ہمارے کچھ نمائندے اسمبلیوں میں پہنچ سکیں۔

حالیہ انتخابات (اکتوبر ۱۹۹۳ء) کے حوالے سے مسیحی برادری حسبِ سابق بٹی ہوئی ہے۔ کاتھولک کلیسیا لاہور ڈایوسیس کے بشپ ریورنڈ ارمانڈو ٹرینڈاڈ نے جداگانہ طریقِ انتخاب کو قطعی مسترد

کرتے ہوئے اس کے مکمل بائیکاٹ کا اعلان کیا ہے۔ ان کے الفاظ میں ان انتخابات میں "میری ڈایوسیس کا کوئی فرد کسی طرح بھی کوئی حصہ نہیں لے گا۔"[11] کانفرنس آف چرچز میجر سپریرز آف پاکستان کے قائم کردہ "جسٹس اینڈ پیس کمیشن پاکستان" نے انتخابات کے بائیکاٹ کے فیصلے کی توثیق اور تعریف کی ہے۔[12]

مسیحی مذہبی رہنماؤں کے بائیکاٹ کے اعلان کے باوجود قومی اسمبلی کی چار مسیحی نشستوں کے لیے ۲۵ امیدوار میدان میں ہیں۔[13] ان امیدواروں میں نمایاں نام جے - سالک، پیٹر جان سہوترا، طارق کرسٹوفر قیصر، فادر روفن جولیس، جوزف فرانسس، ناصر محمود کھوکھر، ڈاکٹر شمشاد ثناء اللہ اور عمانویل ظفر ایڈووکیٹ کے ہیں۔

مسیحی امیدواروں کی اکثریت کسی نہ کسی پارٹی سے منسلک ہے۔ الیکشن کمیشن نے جن پندرہ رجسٹرڈ اقلیتی پارٹیوں کو نشانات دیے ہیں۔ ان میں سے گیارہ کے ناموں میں لفظ "مسیحی" شامل ہے۔ باقی تین کی قیادت میں مسیحی شامل ہیں، صرف ایک خالص ہندو پارٹی ہے۔ مگر مسیحی پارٹیوں کے بارے میں رازہائے درون پردہ جاننے والوں کی رائے ہے کہ ان میں سے زیادہ تر پارٹیاں ایک ایک، دو دو خاندانوں سے زیادہ کی حمایت نہیں رکھتیں اور ۶،۵۷،۷۵۰ مسیحی ووٹروں (۱۹۸۸ء کے اعداد و شمار کے مطابق) کے ساتھ ان کا کوئی رابطہ نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ چند ہی مسیحی جماعتوں کو حقیقتاً جماعت کہا جا سکتا ہے۔

نواز شریف حکومت کے دوران میں جناب جے - سالک اپنی احتجاجی سیاست اور نت نئے حربوں کے ذریعے اخبارات کی سُرخیوں کی زینت بنے رہے۔ وہ واحد مسیحی رکن تھے جو حزبِ اختلاف کے ساتھ بیٹھتے تھے اور خیال کیا جاتا تھا کہ وہ پاکستان پیپلز پارٹی کے قریب ہیں مگر اکتوبر ۱۹۹۳ء کا انتخاب وہ آزادانہ طور پر لڑ رہے ہیں۔ گزشتہ انتخابات (اکتوبر ۱۹۹۰ء) میں مسیحی امیدواروں میں اُنہوں نے سب سے زیادہ ووٹ حاصل کیے تھے۔ "جے سالک، تیرا یسوع مالک" کے نعرے پر جیتنے والے اور سیاسی کامیابیوں کا طویل ریکارڈ رکھنے والے جے - سالک ایک مضبوط امیدوار خیال کیے جاتے ہیں۔

پیٹر جان سہوترا نواز شریف حکومت میں "وزیرِ مملکت برائے اقلیتی امور" تھے۔ وہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہونے سے پہلے مسیحی برادری کی سیاست میں نمایاں چلے آ رہے تھے۔ وہ اپنے علاقے میں کونسلر رہ چکے تھے۔ ۱۹۸۵ء کے انتخابات میں پنجاب اسمبلی کے رکن اور پارلیمانی سیکرٹری تھے۔ اُن کی سیاسی کامیابیوں میں بشپ آف فیصل آباد جناب ڈاکٹر جان جوزف کی حمایت نے اہم کردار ادا کیا تھا۔

پاکستان مسلم لیگ سے وابستہ رہے اور نواز شریف حکومت کی پالیسیوں کی بھرپور تائید کی۔ اُنہوں نے واضح کیا کہ "شرعی قوانین اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کرتے ہیں۔"[14] پاکستان میں اقلیتوں کو تمام

بنیادی حقوق حاصل ہیں اور مذہب کی بنیاد پر شہریوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں برتی جاتی۔"[۱۵]
شناختی کارڈ میں مذہب کے اندراج کے حوالے سے پیٹر جان سہوترا کے طرزِ عمل سے نہ صرف احتجاج پسند مسیحی حلقے خوش نہیں تھے بلکہ ایک اطلاع کے مطابق بشپ جان جوزف بھی ناراض تھے۔ اب جب کہ "کانفرنس آف چرچز میجر سپریرز آف پاکستان" انتخاب کے بائیکاٹ کا اعلان کر چکی ہے، پیٹر جان سہوترا کو بشپ موصوف کی تائید حاصل نہیں، البتہ اُنہیں پاکستان مسلم لیگ (نواز شریف گروپ) کی بھرپور تائید حاصل ہے۔

گوجرانوالہ کے روفن جولیس نے جو پیشے کے لحاظ سے کاہن تھے، نومبر ۱۹۸۸ء کے انتخابات میں حصہ لیا اور بے نظیر حکومت میں وزیرِ مملکت برائے اقلیتی اُمور رہے تھے۔ اکتوبر ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں بھی کامیاب ہوئے اور حکومتِ وقت کے ہم نوا رہے۔ پندرہ سال تک کاہن رہنے کے باعث لفظ "فادر" روفن جولیس کے نام کا حصہ بن چکا ہے، اگرچہ اب وہ شادی شدہ زندگی گزار رہے ہیں اور ایک بچے کے باپ ہیں۔ حالیہ انتخابات میں اُنہیں پاکستان مسلم لیگ (نواز شریف گروپ) کی تائید و حمایت حاصل ہے۔

سابق اسمبلی کے رکن جناب طارق کرسٹوفر قیصر بھی امیدوار ہیں۔ وہ اپنے آبائی گاؤں مارٹن پور کے نمبردار ہیں۔ پاکستان مسیحی پارٹی کے پلیٹ فارم سے انتخابات میں حصہ لے رہے ہیں۔ نواز شریف حکومت کے دور میں قومی اسمبلی میں فعّال رہے ہیں۔ اُنہوں نے قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں میں اقلیتی نشستوں میں اضافے اور حلقہ بندی کے لیے آئینی ترمیم کے لیے دو بل قومی اسمبلی میں پیش کیے تھے مگر یہ بل اِس لیے مسترد کر دیے گئے کہ "حکومت اِس معاملے پر خود ایک بل لانا چاہتی تھی۔"[۱۶]

جوزف فرانسس پاکستان پیپلز پارٹی کے تعاون سے انتخاب میں حصہ لے رہے ہیں۔ یوں وہ پاکستان کرسچن نیشنل پارٹی کے سیکرٹری جنرل ہیں اور ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کی منتظمہ کے رکن ہیں۔ وہ طویل عرصے سے پاکستان پیپلز پارٹی سے وابستہ چلے آ رہے ہیں۔ ۱۹۷۷ء میں مارشل لاء لگنے پر بیرون ملک چلے گئے اور اُس وقت واپس آئے جب ۱۹۸۲ء میں ایم - آر - ڈی (تحریک برائے بحالی جمہوریت) کا آغاز ہو چکا تھا۔ وہ ذوالفقار علی بھٹو کے اِن اقدامات کے ناقد ہیں کہ اسلام کو پاکستان کا سرکاری مذہب قرار دیا گیا۔ (دستور پاکستان - ۱۹۷۳ء)، احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت تسلیم کرتے ہوئے دستور میں ترمیم کی گئی۔ شراب پر پابندی لگائی گئی اور اتوار کی جگہ جمعہ کو ہفتہ وار تعطیل منظور کی گئی، تاہم بھٹو اُن کے ہیرو اس لیے ہیں کہ "یہ بھٹو ہی تھے جنھوں نے ہمیں آواز دی۔"[۱۷]

جوزف فرانسس چرچ رہنماؤں میں چنداں مقبول نہیں کیوں کہ وہ اُن کے طرزِ عمل کے شدید ناقد ہیں۔ مسیحی جریدے "شاداب" نے لکھا ہے کہ[۱۸] "جے - سالک کے مطابق پیپلز پارٹی اور اس کے

اتحادیوں نے اُنہیں الیکشن کے دوران میں اپنی حمایت کا یقین دلایا ہے۔" مگر جب جوزف فرانسس سے پوچھا گیا کہ کیا جے۔ سالک اُن کے لیے کوئی مسئلہ بن رہے ہیں تو اُنہوں نے جواب دیا کہ[19] "وہ میرے لیے مسئلہ نہیں بلکہ میں اُن کے لیے ہوں۔ آخر الامر پاکستان پیپلز پارٹی کی حمایت جوزف فرانسس کو حاصل ہے۔"

ناصر محمود کھوکھر ۱۹۸۵ء کے انتخابات میں قومی اسمبلی میں پہنچے تھے۔ اس بار وہ اپنی جماعت "پاکستان کرسچن ایسوسی ایشن" کے ٹکٹ پر انتخاب میں حصہ لے رہے ہیں۔

ڈاکٹر شمشاد ثناء اللہ معروف مسیحی رہنما کیپٹن ثناء اللہ (م ۱۹۹۰ء) کے صاحبزادے ہیں اور یونائیٹڈ کرسچن فرنٹ کے ٹکٹ پر انتخابات میں حصہ لے رہے ہیں۔ وہ سینٹ پالز کیمبرج اسکول راولپنڈی کے پرنسپل ہیں اور انہوں نے یونیورسٹی آف سدرن کیلیفورنیا سے تعلیم و تدریس میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ گزشتہ انتخابات میں کامیاب نہیں ہوسکے تھے۔

عمانویل ظفر ایڈووکیٹ مسیحی عوامی پارٹی کے امیدوار ہیں۔ وہ ۱۹۸۵ء کی قومی اسمبلی میں منتخب ہوئے تھے۔

طریقِ انتخاب کے حوالے سے ایک دلچسپ صورت حال یہ سامنے آئی ہے کہ جناب نعیم شاکر ایڈووکیٹ نے، جو مذہباً مسیحی ہیں، لاہور ہائی کورٹ میں ایک عرض داشت پیش کی کہ وہ پنجاب اسمبلی کی عمومی نشست پر انتخاب لڑنے کے اہل ہیں۔ اُن کے دلائل کے مطابق دستور پاکستان (۱۹۷۳ء)، میں قومی اسمبلی کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ "قومی اسمبلی [۲۰۷ مسلم] ارکان پر مشتمل ہوگی جو قانون کے مطابق براہ راست آزادانہ ووٹ سے منتخب ہوں گے" (دفعہ ۵۱) مگر صوبائی اسمبلیوں کے بارے میں عمومی ارکان کی تعداد بتاتے ہوئے مذہب کا ذکر نہیں کیا گیا ہے اور ان ارکان اسمبلی کے انتخاب کے لیے ووٹروں کے لیے جو شرائط رکھی گئی ہیں، ان میں مذہب کی بنیاد پر کوئی امتیاز نہیں برتا گیا۔ [دیکھیے: دفعہ ۱۰۶(۱)] لاہور ہائی کورٹ نے ان کے نقطۂ نظر سے اتفاق نہ کیا۔ انہوں نے سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی جس نے اپیل کی سماعت کے بعد جناب نعیم شاکر ایڈووکیٹ کو پنجاب اسمبلی کی نشست پر انتخاب لڑنے کا اہل قرار دیا۔ چنانچہ اُنہوں نے پنجاب اسمبلی کی نشست پی پی - ۱۲۶ سے کاغذات نامزدگی جمع کرائے ہیں۔ یہی مثال پیشِ نظر رکھتے ہوئے سندھ صوبائی اسمبلی کی نشست پی ایس - ۹۰، کراچی (جنوبی) - ۶ کے ریٹرننگ آفیسر نے جناب پرویز ڈینیل بھٹی کے کاغذات نامزدگی قبول کیے ہیں۔ عدالتی فیصلے سے صورتِ حال یہ بن گئی ہے کہ قومی اسمبلی کے لیے جداگانہ اور صوبائی اسمبلیوں کے لیے مخلوط طریقِ انتخاب کا اصول تسلیم کرلیا گیا ہے۔ یہ صورت حال آئندہ ضمنی انتخابات میں بھی جاری رہے گی۔ طریقِ انتخاب کی یکسانیت کے لیے دستوری ترمیم کی ضرورت ہوگی، جو جداگانہ یا مخلوط

کسی بھی طریقِ انتخاب کے لیے کی جا سکتی ہے، بہر حال یہ تو آئندہ قومی اسمبلی کے وجود پر آنے ہی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ پلڑا کس طرف جھکنے والا ہے۔ (پاکستان مسلم لیگ، پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان اسلامک فرنٹ تین جماعتوں کے منشور اقلیتوں کے بارے میں بہت واضح ہیں۔)

انتخابی مہم میں اپنے حریف امیدواروں کی کمزوریاں نمایاں کرنا اور اپنی کارکردگی سے ووٹروں کو متاثر کرنا کھیل کا حصّہ ہے۔ تمام امیدوار یہی کچھ کر رہے ہیں، تاہم پاکستان مسلم لیگ (نواز شریف گروپ) کے حمایت یافتہ جداگانہ طریقِ انتخاب کی مخالفت نہیں کر رہے جب کہ باقی امیدوار چاہے وہ آزاد ہیں یا پاکستان پیپلز پارٹی کے حمایت یافتہ، مخلوط طریقِ انتخاب کے حق میں آواز اٹھا رہے ہیں۔ قومی اسمبلی کے لیے پورے ملک کو ایک حلقہ اور صوبائی اسمبلیوں کے لیے ہر صوبے کو ایک حلقہ قرار دیا گیا ہے، اس سے امیدواروں کو جو طویل سفر کرنے پڑتے ہیں اور انتخابی اخراجات برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ ہر امیدوار اِس پر شکوہ سنج ہے اور حلقہ بندیوں کا مطالبہ کرتا ہے۔ سینیٹ میں نمائندگی کے لیے آواز اٹھائی جا رہی ہے۔ بعض امیدوار حدود آرڈیننس، شریعت ایکٹ، قانون گستاخی رسول ﷺ اور قانونِ شہادت کو اپنے حقوق کے خلاف سمجھتے ہیں اور ان کے منسوخ کرنے کی بات کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں بعض مبیّنہ واقعات کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔ مگر نظریاتی مسائل سے کہیں زیادہ مسیحی اقلیّت کے مادی مسائل ہیں جن کی جانب فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ مسیحی اکثریت کچی آبادیوں میں رہائش پذیر ہے جہاں بنیادی شہری سہولتوں کا فقدان ہے۔ اولاً ان کچی آبادیوں کو قانونی حیثیت حاصل نہیں، کسی بھی وقت یہاں کے مکینوں کو بے دخل کیا جا سکتا ہے۔ کچی آبادیوں کے مکینوں کو حقوق ملکیت یا موجودہ جگہ کے متبادل رہائش مہیّا کرنا ایک مسئلہ ہے۔ ان آبادیوں میں صفائی، بجلی اور پانی کی فراہمی، بچوں کے لیے تعلیم اور طب و صحت کی سہولتوں کی فراہمی حقیقی مسائل ہیں۔

مسیحی برادری کو دیگر اقلیّتوں کی طرح پرمٹ پر شراب مل سکتی ہے۔ چوں کہ مسیحی آبادی کی اکثریت غریب ہے، اِس لیے نوجوان اپنی آمدنی بڑھانے کی خاطر ناجائز فروشوں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں اور اِس مسئلے پر وہ ہمیشہ بلیک میل کیے جاتے ہیں۔ مسیحی برادری کے لیے شراب پر پابندی ایک دیرینہ مطالبہ ہے۔ اگر نوجوان شراب نوشی کے عادی ہو جاتے ہیں تو یہ غریب خاندانوں کے خود بہت بڑا نقصان ہے اور اگر معاشرے میں شراب عام کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں تو یہ بھی قابلِ برداشت نہیں۔ پاکستان کرسچن کانگرس کے صدر جناب ناظر بھٹی نے وفاقی شرعی عدالت میں مسیحیوں کے لیے شراب کے پرمٹ جاری کیے جانے کے خلاف ایک پٹیشن دائر کی تھی۔[۲۰] طارق کرسٹوفر قیصر نے شراب کے پرمٹ بند کیے جانے کا مطالبہ کیا تھا۔[۲۱]

حواشی

۱۔ حکومتِ پاکستان، Census Report of Pakistan، اسلام آباد: شعبۂ شماریات، حکومتِ پاکستان (دسمبر ۱۹۸۴ء)، ص ۶۸

۲۔ جوزف ارشد، پاکستان میں مسیحی تشخص کی جدوجہد، پندرہ روزہ "کاتھولک نقیب" (لاہور)، یکم تا ۱۵ اکتوبر ۱۹۹۱ء

۳۔ لورنس ویسلنڈ، The Christian Minority in the North West Frontier Province of Pakistan، ماہنامہ "المشیر" (راولپنڈی)، اپریل - جون ۱۹۷۳ء، ص ۱۱۸

۴۔ اس مسئلے پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکمران طبقے اور برطانوی مشنریوں کی سوچ بالکل متضاد تھی۔ حکمران طبقہ جب اینگلو انڈین یا یوریشین گروہ کی مخالفت میں پیش پیش تھا تو برطانوی مشنری مقامی آبادی سے شادیاں رچا رہے تھے اور اُنہیں اپنی ہند نژاد اولاد پر بڑا فخر تھا۔ مثال کے طور پر لنڈن مشنری سوسائٹی کے ریورنڈ چارلس میڈ نے تیسری شادی ایک مقامی خاتون سے کی اور ریورنڈ میڈ کے ۲۳ بچے تھے۔

۵۔ ماضی کے اس دلچسپ طبقے کے لیے دیکھیے:

*Dover, C., Half Caste, London: Secker and Warburg (1937)
* Anthony, F., Britain's Betrayal in India: The Story of the Anglo - Indian Community , Bombay: Allied Publishers (1969)
* Ballhatchet, K., Race, Sex and Class under the Raj, London: Weidenfeld and Nicolson (1980).

۶۔ حکومتِ پاکستان، The Constitution of the Islmic Republic of Pakistan، فیڈرل جوڈیشل اکیڈمی (۱۹۸۹ء)، دفعات ۵۱ (۲- الف) اور ۱۰۶ (۳)

۷۔ جوشوا فضل الدین کیتھولک مسیحی تھے اور جہلم سے تعلق رکھتے تھے۔ اُنہوں نے جہلم، فیصل آباد اور راولپنڈی کے تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کی تھی۔ لاء کالج پنجاب یونیورسٹی سے ایل - ایل - بی کی سند لی تھی اور وکالت کے پیشے سے وابستہ تھے۔ وکالت کے راستے سیاست میں داخل ہوئے۔ ۱۹۵۱ء میں پنجاب صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور وحدت مغربی پاکستان (۱۹۵۵ء) کے بعد ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت اعلیٰ میں نائب وزیر خزانہ اور بعد میں مظفر علی قزلباش کے دور میں نائب وزیر قانون رہے۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء تک وہ مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن تھے۔

جوشوا فضل الدین اردو، پنجابی اور انگریزی کے اچھے قلم کار تھے۔

۸۔ پندرہ روزہ "شاداب" (لاہور)، ۱۶ تا ۳۱ دسمبر ۱۹۹۱ء، ص ۱۹

۹۔ "پاکستان ڈیموکریٹک الائنس" نے اکتوبر ۱۹۹۰ء کے انتخابی منشور میں اقلیّتوں کے بارے میں لکھا تھا کہ "مخلوط طریقۂ انتخاب کو بحال کیا جائے گا اور ساتھ ہی ساتھ اقلیّتوں کو قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں نمائندگی دی جائے گی۔ اقلیّتوں کے جملہ حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔" [قیوم نظامی، بے نظیر حکومت کے ۲۰ ماہ، لاہور: پاکستان پبلشرز (۱۹۹۰ء)، ص ۱۴۴]

۱۰۔ انٹرویو بشپ الیگزینڈر جان ملک، روزنامہ "پاکستان" (لاہور)، ۲۱ دسمبر ۱۹۹۱ء

۱۱۔ پندرہ روزہ "شاداب" (لاہور)، ۳۱ جولائی ۱۹۹۳ء

۱۲۔ روزنامہ "ڈان" (کراچی)، ۱۲ ستمبر ۱۹۹۳ء، نیز ماہنامہ "عالمِ اسلام اور عیسائیت" (اسلام آباد)، ستمبر ۱۹۹۳ء، ص ۳۰

۱۳۔ روزنامہ "دی نیوز" (اسلام آباد)، ۱۵ ستمبر ۱۹۹۳ء

۱۴۔ روزنامہ "جسارت" (کراچی)، ۲۶ ستمبر ۱۹۹۱ء

۱۵۔ روزنامہ "دی نیوز" (اسلام آباد)، ۲۴ اکتوبر ۱۹۹۱ء، نیز روزنامہ "جنگ" (راولپنڈی)، ۲۸ جون ۱۹۹۲ء

۱۶۔ روزنامہ "جنگ" (راولپنڈی)، ۶ جون ۱۹۹۲ء، نیز ۵ اگست ۱۹۹۲ء

۱۷۔ انٹرویو جوزف فرانسس، روزنامہ "فرنٹیر پوسٹ" (پشاور)، ۲۳ اگست ۱۹۹۳ء

۱۸۔ پندرہ روزہ "شاداب" (لاہور)، یکم اگست ۱۹۹۳ء

۱۹۔ انٹرویو جوزف فرانسس، روزنامہ "فرنٹیر پوسٹ" (پشاور)، ۲۳ اگست ۱۹۹۳ء

۲۰۔ روزنامہ "نوائے وقت" (راولپنڈی)، ۱۱ فروری ۱۹۹۲ء

۲۱۔ روزنامہ "پاکستان" (لاہور)، ۲۶ مئی ۱۹۹۲ء